

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورس

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں

(1) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطہ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے، مزید برآں 44 آڈیو کیسٹ کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔

(2) عربی گرامر خط و کتابت کورس (1، 2، 3)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

(3) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیات قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراپٹنس کے حصول اور دیگر معلومات کیلئے درج ذیل پتے پر رجوع کریں!

ناظم شعبہ خط و کتابت کورس

قرآن اکیڈمی، 36- کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5869501-03

وَمِنْ بَيِّنَاتِ الْحُكْمِ فَفَقَدْنَا أُوتِي
خَيْرًا كَثِيرًا

۱۷-۱-۵۶

(البقرہ: ۲۶۹)

لاہور

ماہنامہ

حکیم قرآن

میاں گار ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی، ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر تنظیم، حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

نائب مدیر، حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی - پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

شمارہ ۱

ذوالقعدہ ۱۴۲۳ھ - جنوری ۲۰۰۲ء

جلد ۲۳

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرف اول

پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں حالیہ پیش رفت اور مذاکرات کی بحالی کا اعلان درحقیقت امریکہ کے دباؤ کا نتیجہ ہے؛ جس کا مقصد کشمیر کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرا کر پاکستان کو اس کی ایٹمی صلاحیت سے دست برداری پر مجبور کرنا ہے۔ امریکہ کی حکمت عملی یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت مسئلہ کشمیر کے حل سمیت اپنے باہمی تعلقات ”کچھ دو کچھ لو“ کے اصول کی بنیاد پر معمول پر لے آئیں۔ یوں پاکستان کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں رہے گا کہ اس کی ایٹمی صلاحیت ہندوستان کے خلاف ایک ڈیٹرنٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام اپنی ابتداء ہی سے امریکہ اور مغربی ممالک کی نظروں میں بری طرح کھلتا رہا ہے۔ امریکہ کے نزدیک جوہری صلاحیت کے حوالے سے عراق، ایران اور لیبیا کا معاملہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور اس ضمن میں اب ”Axis of Evil“ پاکستان ہی کو قرار دیا جا رہا ہے۔ ایران اور لیبیا نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ایٹمی میدان میں ان کی ترقی پاکستان ہی کی مرہون منت ہے؛ جس کے نتیجے میں ہمارے خلاف کارروائی کرنے کے لئے کافی مواد اکٹھا کیا جا چکا ہے۔ نہ صرف امریکہ بلکہ جاپان، جرمنی، فرانس اور روس بھی اس امر پر متفق ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کر دیا جائے اور ایک اسلامی ملک کے یہ زہریلے دانت نکال دیئے جائیں۔ ہم نے بحیثیت قوم اللہ کی اس نعمت کا حق ادا نہیں کیا؛ چنانچہ قرآن یہی بتاتے ہیں کہ اس نعمت کے سلب ہونے کا وقت قریب ہے۔ مشیت ایزدی میں اس کی حفاظت منظور ہوئی تو بہتری کی کوئی صورت بھی نکل سکتی ہے لیکن بظاہر آثار کوئی حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ہم دلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے کے نعرے لگاتے ہیں لیکن درحقیقت ہمارے اندر دم نہیں ہے کہ بھارت کا مقابلہ کریں۔ اس صورتحال سے نکلنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے وفادار بن جائیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ان تمام باتوں کو ختم کر دیں جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہیں۔ ۰۰

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآن حکیم کی جامع ترین سورت
وہ
امُّ الْمُسَبِّحَاتِ : سورتہ الحدید
(۹)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم
 ﴿یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ یَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ
 بُشْرانِکُمْ الْیَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرَى مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ ذَٰلِکَ
 هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱﴾ یَوْمَ یَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِینَ آمَنُوا
 انظُرُونَا نَقْتَسِبْ مِنْ نُورِکُمْ ۗ قِیلَ ارْجِعُوا وَرَاءَ کُمْ فَاتِّمِسُوا نُورًا ۗ
 فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ ۗ بَاطِنُهُ فِیهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ
 الْعَذَابُ ﴿۲﴾ یَسَادُونَہُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۗ قَالُوا بَلٰی وَلٰكِنَّا کُنَّا نَسْتَم
 أَنْفُسَکُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْکُمُ الْأَمَانِیُّ حَتَّى جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ
 وَغَرَّکُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ﴿۳﴾ (آیات ۱۳ تا ۱۴) صدق اللہ العظیم

سابقہ مباحث کا اعادہ

تفہیم کے لئے سورتہ الحدید کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ جو
 ۶ آیات (۶ تا ۱۱) پر مشتمل ہے میرے اندازے میں یہ ذات و صفات باری تعالیٰ پر
 قرآن حکیم کا جامع ترین اور اہم ترین مقام ہے۔ دوسرا حصہ پانچ آیات (۷ تا ۱۱) پر
 مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۷) میں دین کے کل تقاضوں کو دو

اصطلاحات (ایمان اور انفاق) میں بیان کر دیا گیا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿إِيمَانًا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْفُسُهُمْ﴾ ”ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں)“۔ پھر آیت ۸ اور ۱۰ میں ذرا زجر کے انداز میں فرمایا گیا ہے کہ کیوں ایمان نہیں رکھتے؟ اور یہ کہ کیوں خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں؟ جبکہ آیت ۹ اور آیت ۱۱ میں ترغیب و تشویق، حوصلہ افزائی اور ابھارنے کا انداز ہے کہ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھو! اگر اپنے گریبانوں میں جھانکو اور محسوس کرو کہ وہ یقین والا ایمان نہیں ہے تب بھی مایوس ہونے کی بات نہیں تمہارے لئے قرآن کریم کی آیاتِ بینات موجود ہیں! ان سے تم اپنے تمام باطنی اندھیروں کو زائل کر کے اپنے باطن کو نورِ ایمان سے منور کر سکتے ہو۔ اور اس سلسلے کی آخری آیت (آیت ۱۱) میں فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ”کون ہے وہ جو قرض دے اللہ کو قرضِ حسنہ؟“ اس میں ایک طرح سے غیرتِ ایمانی کو بھی لگا کر لکھا گیا ہے کہ ہمت کرو! ایمان و یقین کا تقاضا ہے کہ اللہ کی راہ میں سب کچھ لگا دو اور کھپا دو۔

اس آیت سے متعلق ایک واقعہ ہے جو کہ ماقبل درس میں بیان ہونے سے رہ گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) جب قرآن پڑھتے یا سنتے تھے تو ان کا تاثر کیا ہوتا تھا! ان کے دلوں میں فوری طور پر عمل کے لئے آمادگی پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضور اکرم (ﷺ) نے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو سنائی تو حضرت ابوالدرداء انصاری (رضی اللہ عنہ) نے فوراً اس پکار پر لبیک کہا۔ ان کا مدینے میں سب سے بڑا باغ تھا جس میں کھجور کے چھ سو درخت تھے۔ باغ میں چشمہ بھی تھا۔ اسی میں ان کا رہائشی مکان بھی تھا۔ ایک انسان کا دنیا میں آسائشوں کا یہی تصور ہو سکتا ہے تاکہ گھر کے ساتھ خوبصورت باغ ہو، گھنیری چھاؤں ہو، چشمہ ہو، وغیرہ۔ تو ان کے پاس بھی گویا یہ ساری سہولتیں تھیں۔ انہوں نے فوراً سوال کیا کہ حضور! کیا اللہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے؟ حضور (ﷺ) نے فرمایا: ”ہاں“۔ تو حضرت ابوالدرداء (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: تو ہاتھ بڑھائیے! حضور نے اپنا دست مبارک بڑھایا تو اپنا ہاتھ حضور (ﷺ) کے

ہاتھ میں دیتے ہوئے عرض کیا: میں نے اپنا باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ اس کے بعد وہاں سے خوشیاں مناتے ہوئے اپنے گھر کی طرف لوٹے۔ یہاں یہ بھی نوٹ کیجئے کہ بعض اوقات انسان جذباتی طور پر کوئی کام کر گزرتا ہے، کوئی بہت بڑی چھلانگ لگا تو لیتا ہے لیکن پھر فوراً ایک رد عمل بھی ہوتا ہے کہ یہ میں کیا کر بیٹھا! لیکن حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اسے بڑی کامیابی سمجھا اور مسرور ہو کر واپس گھر گئے۔ اب باغ میں داخل بھی نہیں ہوئے یہ سوچ کر کہ اب یہ اللہ کا ہو چکا ہے باغ کی فصیل کے باہر سے ہی پکارا: اے ام الدرداء! یہاں سے نکل آؤ، میں نے یہ باغ اللہ کو دے دیا ہے! اور وہ بھی اللہ کی بندی وہاں سے اپنا ذاتی سامان لے کر یہ کہتی ہوئی نکل آئی کہ یہ تم نے بہت عمدہ سودا کیا ہے۔ دراصل یہی انداز تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جس کی وجہ سے کل بیس برس میں ”مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ“ کے ہاتھوں تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں عمل کے لئے دلی آمادگی اس قدر تھی کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو حکم بھی آتا اس پر عمل کے لئے فوراً تیار ہو جاتے۔ ظاہر ہے دلوں میں ایمان پہلے سے موجود ہے تو عمل میں تاخیر کیسی!

اس سورہ مبارکہ کا تیسرا حصہ چار آیات پر مشتمل ہے اور جس طرح پہلے حصے میں بڑی اہم آیت تھی: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ بالکل اسی مقام و مرتبہ کی حامل آیت اس حصے میں بھی ہے جو دراصل منافقت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہے۔ ہم یہ بات جان چکے ہیں کہ آخرت میں ایک چھلنی تو کھلم کھلا کافروں اور مسلمان ہونے کے دعوے داروں کے مابین لگے گی جو انہیں علیحدہ علیحدہ کر دے گی۔ اس کے بعد مسلمان سمجھے جانے والوں کے مابین ایک چھلنی لگے گی یہ چھان پھٹک کرنے کے لئے کہ ان میں کون واقعی مؤمن تھا اور کون جھوٹ موٹ کا مؤمن بنا ہوا تھا۔ یعنی جھوٹے اور سچے کے مابین ایک تمیز ہو جائے گی۔ یہ ایک مرحلہ ہے جسے ہم عام طور پر اپنے محاورے میں ”پل صراط“ کہتے ہیں۔ اس پل صراط کا تصور یہاں بھی موجود ہے اور مدنی سورتوں کے اس سلسلہ کی آخری سورۃ سورۃ التحریم میں بھی بعینہ انہی الفاظ

میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ مضمون کے اعتبار سے سورہ مریم میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ۖ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۖ﴾ (آیات ۷۱، ۷۲) ”اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اس (جہنم) پر وارد نہ ہو۔ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کے ذمہ ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو (دنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اس میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔“ یعنی چاہے مؤمن ہو، کافر ہو، مسلم ہو، منافق ہو، سب کو ایک بار پل صراط پر سے گزارا جائے گا۔ مفسرین نے اس کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ اہل ایمان کو بھی اندازہ ہو جائے کہ اللہ نے انہیں کس خطرناک شے سے بچایا ہے، ورنہ شاید انہیں اندازہ نہ ہو سکے کہ یہ کتنی بڑی کامیابی ہے اور ان پر اللہ کا کتنا بڑا فضل ہوا ہے۔

پل صراط پر سے گزرنا کس طرح کا ہوگا، اس کی حقیقت تو وہیں جا کر کھلے گی۔ میدانِ حشر کی کیفیات کو ہم صرف ان کے قریب ترین الفاظ میں ہی بیان کر سکتے ہیں جو قرآن مجید میں آئے ہیں، ان کی اصل حقیقت ہمیں یہاں نہیں معلوم ہو سکتی۔ بہر حال وہ کوئی ایسا مرحلہ ہوگا کہ شدید گھپ اندھیرا ہوگا، وہاں اہل ایمان کے دلوں میں موجود ایمان اور ان کے اعمالِ صالحہ کے نور کا ظہور ہو جائے گا جو وہ دنیا سے لے کر گئے ہوں گے۔ ان کا نورِ ایمان ان کے سامنے اور اعمالِ صالحہ کا نور ان کی داہنی طرف ہوگا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ﴾ ”جس دن کہ تم دیکھو گے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ دوڑتا ہوا ہوگا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف۔“ یعنی وہ خود چل رہے ہوں گے اور ان کا نور ان کے دائیں اور سامنے کی طرف چل رہا ہوگا۔ علامہ ابن جریر طبری کی تفسیر میں حضور ﷺ کا اس بارے میں جو قول نقل ہوا ہے وہ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ”کسی کو جو نور ملے گا وہ اتنا ہوگا کہ اس کی روشنی مدینے سے صنعاء تک جائے گی۔ اور کسی کو بس اتنا نور ملے گا کہ اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی۔“ اور اس دن

وہ شخص بھی بہت خوش نصیب ہوگا جس کے بس قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے گی۔ بہر حال اہل ایمان اپنے اس نورِ ایمان اور نورِ اعمالِ صالحہ کی روشنی میں اس راستے سے گزر جائیں گے۔ ان سے کہا جائے گا: ﴿بُشِّرْكُمْ الْيَوْمَ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ ﴿بشارت ہے تمہارے لئے آج کے دن اُن باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں اور ان میں تمہیں اب ہمیشہ رہنا ہے یہی ہے اصل اور بڑی کامیابی۔“

اس کے برعکس کیفیت کیا ہوگی، فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ﴾ ﴿اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو (ہمیں مہلت دو) تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔“ یہ منافقین کا تذکرہ ہو رہا ہے جو ایمان سے تہی دست تھے مگر دنیا میں مسلمان سمجھے جاتے تھے۔ اس سورہ مبارکہ کی یہ تین آیات (۱۳، ۱۴ اور ۱۵) نفاق کے موضوع پر قرآن مجید کا اہم ترین مقام ہے۔ درحقیقت سورۃ الحدید جسے اُمُّ السُّجَّات کہا جاتا ہے اس میں سلسلہٴ سُجَّات کی بقیہ نو مدنی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ اور جامع انڈکس موجود ہے۔ گیارہ آیات پر مشتمل سورۃ المنافقون پوری کی پوری اسی نفاق کے موضوع پر ہے اور اس کی پہلی آٹھ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے سورۃ الحدید کی ان تین آیات میں گویا اس کی مزید تشریح ہے۔

نفاق کی حقیقت اور مراحل و مدارج

”نفاق“ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے نوٹ کیجئے کہ لفظ نفاق، اور انفاق کا مادہ ایک ہی ہے یعنی ”ن“ ف“ق“۔ نَفَقَ، يَنْفُقُ سے افعال کے وزن پر لفظ انفاق بنا ہے جس کے معنی ہیں ختم ہو جانا، خرچ ہو جانا۔ جیسے کہا جاتا ہے: نَفَقَ الْفَرَسُ ”گھوڑا مر گیا“ یا ”گھوڑا کام آ گیا“۔ اور نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ ”پیسے ختم ہو گئے!“ یہاں اس انفاق کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے بایں الفاظ: ﴿آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِينَ فِيهِ﴾ اور اسی مادے سے باب مفاعلہ میں ”منافقت“ بنا ہے۔ ”نَفَقَ“

سے مراد ہے زیر زمین راستہ یا سرنگ جس کے دو منہ ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں بادشاہ عام طور پر ایسے فوجی قلعے بنواتے تھے کہ ان میں محل بھی ہوتے تھے اور شکست کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لئے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں جو دُور کسی جنگل میں جا کر نکلتی تھیں، تاکہ دشمن اگر صدر دروازے سے داخل ہو ہی جائے تو وہ اس سرنگ کے ذریعے سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فرار ہو سکیں۔ لہذا پچاؤ کے لئے یہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں۔ اسی طرح گوہ جو ایک صحرائی جانور ہے، اس میں اللہ نے اتنی عقل رکھی ہے کہ وہ اپنے لئے زیر زمین جو بھٹ یا بل بناتا ہے اس کے دو منہ رکھتا ہے، تاکہ اگر ایک راستے سے شکاری کتے داخل ہوں تو وہ دوسرے راستے سے نکل کر اپنی جان بچا سکے۔ اس لئے کہ صحرائی لوگ اس کا شکار کر کے اس کا گوشت کھاتے تھے۔ گوہ کے بل کو نَافِقَاء کہتے ہیں۔ اسی ”نفاق“ سے لفظ ”منافت“ بنا ہے۔ تو منافقت کی اصل حقیقت یہی ہے کہ اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ ایک تو صادق الایمان ہوتے ہیں جن کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ کھپا دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئندہ ہے وہ آئندہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئندہ ساز میں!

لیکن منافقین کا رویہ اس کے برعکس ہوتا ہے کہ بیچ بیچ کر چلو جان اور مال کو بھی بچاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ بھی چلو۔ بظاہر ایمان لے آنا ان کی مجبوری بن جاتا ہے، کیونکہ اگر سارا قبیلہ ایمان لے آیا ہے تو ان کا بھی ایمان لے آنا معاشرتی دباؤ کی بنا پر لازمی ہو جاتا ہے، ورنہ تو انہیں اپنے قبیلے سے کٹنا پڑتا ہے۔ تو وہ مسلمانوں میں تو شامل ہو جاتے ہیں مگر اپنے آپ کو بچا بچا کر چلتے ہیں۔ تو یہ اپنے آپ کو بچانا دراصل نفاق کی بنیاد ہے۔

اب جب اللہ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کا حکم ہوتا ہے تو مؤمنین صادقین کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جاتے ہیں، لیکن منافقین اس سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں اور جھوٹے بہانے بناتے ہیں۔ یہاں نوٹ کیجئے

کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے حیلے بہانے سے اپنے آپ کو اس کٹھن صورت حال سے بچا تو لیا ہو، لیکن بعد میں اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے حضور ﷺ کے سامنے معذرت پیش کی ہو، تو اس کو نفاق نہیں کہیں گے، بلکہ یہ صرف ضعف ایمان ہے۔ لیکن جب ان بہانوں میں جھوٹ کا عنصر بھی شامل ہو گیا، جھوٹے بہانے بنانے شروع کر دیئے تو یہ نفاق کی پہلی سٹیج ہے۔ پھر ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب انسان سوچتا ہے کہ اس کا تو اعتبار ہی ختم ہو گیا ہے تو اب وہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ اور تیسرا درجہ وہ ہے جب مؤمنین صادقین سے کد ہو جاتی ہے، ان سے بغض ہو جاتا ہے کہ یہ تو پاگل اور جنونی لوگ ہیں جو نہ دائیں دیکھتے ہیں، نہ بائیں دیکھتے ہیں، نہ انہیں آگے کی فکر ہے، نہ پیچھے کی فکر ہے، کوئی مصلحتیں دیکھتے ہی نہیں۔ اب ان کا قول یہ ہوتا ہے: ﴿اَنۡوَمِنۡ كَمَاۤ اَمَنَ السُّفٰہَاۗءُ﴾ ”کیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں جیسے یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں؟“ یہ تو جنونی ہیں، یہ fanatics ہیں۔ تو جب مؤمنین صادقین سے دشمنی ہو گئی تو یہ نفاق کی تیسری سٹیج ہے۔ یہ نفاق دراصل انسان کی باطنی کیفیت ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر انتہائی سٹیج کو پہنچتی ہے۔ یہاں اس کو بہت عمدگی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

نفاق کے بارے میں ایک مغالطے کا ازالہ

ایک بات اور نوٹ کر لیجئے کہ دور نبوی ﷺ میں شعوری نفاق بہت شاذ اور کم تھا۔ عام مغالطہ یہ ہے کہ منافق وہی ہوتا ہے جو جان بوجھ کر منافق بنا ہوا ہو، جبکہ درحقیقت یہ بات نہیں تھی۔ منافقین کی اکثریت وہ تھی جو ایمان تو خلوص کے ساتھ لائے تھے، لیکن ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لئے جو ہمت درکار ہوتی ہے ان میں اس کا فقدان تھا۔ گویا ع ”ہرچہ با د اباد ما کشتی در آب انداختیم“ والی کیفیت نہیں تھی۔ جس شخص میں ایمان کی پختگی اور گہرائی اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگانے کے لئے تیار ہو جائے تو وہ ایک طرح کی پسپائی اختیار کرتا ہے اور ارتدادِ معنوی کا شکار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر پیچھے ہٹنا شروع کرتا ہے۔ درحقیقت اسے یہ خیال

نہیں ہوتا کہ میں منافق ہو گیا ہوں، بلکہ وہ سوچتا ہے کہ ان (سچے اہل ایمان) کو کیا ہو گیا ہے، خواہ مخواہ یہ لوگ جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، آخر صلح سے بھی تو کام چل سکتا ہے اور دشمن کو گڑدے کر بھی تو مارا جاسکتا ہے، جبکہ یہ لوگ ہر وقت جنگ ہی کی فکر رکھتے ہیں۔ غزوہ بدر کے موقع پر ان کا موقف تھا کہ جب اللہ نے فرما دیا ہے کہ دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح مل جائے گی تو قریش کے قافلے کی طرف کیوں نہیں چلتے جہاں بہت سامان و دولت ہے اور ان پچاس آدمیوں کے ہتھیار بھی ہمیں مل جائیں گے۔ مصلحت کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے ادھر جائیں! تو اصل میں وہ لوگ یہ نہیں سمجھ رہے ہوتے کہ ہم جھوٹے ہیں یا ہم دھوکہ دے رہے ہیں، بلکہ یہ اصل میں مسلمانوں کے اندر ہی گڈمڈ ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المنافقون ہی میں فرمایا گیا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ”یہ اس لئے ہوا کہ یہ ایمان لائے، پھر کفر میں چلے گئے“۔ یعنی یہ ایمان تو لائے تھے خلوص کے ساتھ، نہ کہ دھوکہ دینے کے لئے، لیکن پھر رفتہ رفتہ ارتدادِ معنوی کا شکار ہو گئے اور پسپا ہوتے ہوتے کفر تک چلے گئے۔ یعنی ان کا یہ ارتداد اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ انہیں ایک قانونی تحفظ تو حاصل رہتا ہے۔ جیسے دیکھ کسی چوکھٹ یا شہتیر کو اندر سے تو چٹ کر چکی ہوتی ہے لیکن اوپر ایک تہہ چھوڑ دیتی ہے تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ نہ چل جائے کہ اندر اس چوکھٹ یا شہتیر کے ساتھ کیا قیامت گزر رہی ہے۔ تو نفاق بھی دراصل یہی ہے جو باطن میں شروع ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام معنی میں گناہگار اور اس قسم کے غیر شعوری منافق میں بس تعبیر کا فرق ہے۔ گناہگار بھی تو یہی ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ یہ شے اللہ نے حرام کی ہے، پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔ تو اس وقت وہ بھی ایمان سے تہی ہوتا ہے! اس اعتبار سے جان لینا چاہئے کہ گناہگار اور ایسے منافق میں حقیقت کے اعتبار سے باریک سا پردہ ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ اس آیت میں ایک خاص اور اہم نکتہ ہے جو اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اب آگے چلئے! جب اہل ایمان آگے نکل جائیں گے تو یہ منافق مرد اور عورتیں

ان سے کہیں گے: ﴿انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ﴾ کہ ذرا ہمیں مہلت دو ہمارا انتظار کرو تا کہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کر لیں، کچھ اقتباس کر لیں۔ ہم بھی اس سے فائدہ اٹھا کر پل صراط پر سے گزر جائیں۔ ﴿قِيلَ اَرْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُورًا﴾ ”کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو“۔ یعنی اگر تمہارے لئے ممکن ہے تو پیچھے دنیا کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کر کے لے آؤ! اس لئے کہ یہ نور یہاں نہیں دیا گیا، بلکہ یہ دنیا کی زندگی میں کما کر ساتھ لایا گیا ہے۔ دنیا میں ایمان کا بھی کسب کرنا ہوتا ہے اور اعمالِ صالحہ تو ہیں ہی سراسر کسب۔ تو اگر تمہارے لئے بھی ممکن ہو تو لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور یہ نور تلاش کرنے کی کوشش کرو۔

اہل سنت کے ایک عقیدے کی قرآنی بنیاد

آگے فرمایا: ﴿فَضْرِبْ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗۤ اٰبَاتٌ﴾ ”پھر ان کے مابین ایک فیصلہ حائل کر دی جائے گی، جس میں ایک دروازہ ہوگا“۔ یہ فیصلہ تو درحقیقت ایک فصل قائم کرنے کے لئے ہوگی۔ اہل ایمان آگے نکل گئے ہوں گے اور ادھر یہ منافق پیچھے سے پکارتے ہی رہ جائیں گے۔ تو ان کے درمیان فاصلہ تو پہلے سے ہو گیا ہوگا، اب ان کے درمیان فیصلہ بھی حائل کر دی جائے گی۔ ﴿بَاطِنَةٌ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَاظْهَرَةٌ مِنْ قَبْلِهٖ الْعَذَابُ﴾ ”اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر عذاب ہوگا“۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بَاطِنَةٌ اور ظَاہِرَةٌ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ بہت سے حضرات نے اس سے دروازہ مراد لیا ہے کہ اس دروازے کے اندر کی جانب اللہ کی رحمت کا نزول اور اس کے باہر کی جانب عذابِ خداوندی کا ظہور شروع ہو جائے گا۔ لیکن مجھے اس نقطہ نظر میں کافی تاثر تھا۔ اس مقام پر غور و فکر کے نتیجے میں میری جو رائے بنی ہے اس کی تائید مجھے امام رازی سے مل گئی ہے کہ اس ضمیر کی نسبت دروازے کی طرف نہیں ہے، بلکہ سُورِ (فیصل) کی طرف ہے۔ (واللہ اعلم!) یعنی اس فیصلہ کے اندر کی طرف اللہ کی رحمت ہوگی اور اس فیصلہ کے باہر کی طرف اللہ کا عذاب ہوگا۔

اس مقام پر ایک خیال سا آتا ہے کہ اس فیصلہ میں دروازے کی کیا ضرورت ہو

گی؟ لیکن آج مجھے اس پر انشراح ہوا ہے کہ یہاں دروازے کا تذکرہ کیوں ہے۔ یہ درحقیقت ہمارے اہل سنت کے ایک مجمع علیہ عقیدے کے لئے بنیاد ہے، جس کے لئے قرآن مجید میں اس کے علاوہ کہیں اور ذکر نہیں ہے۔ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کی کچھ رمت بھی ہوگی وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ جہنم میں خلود صرف ان کے لئے ہے جن کے دلوں میں سرے سے ایمان کی کوئی رمت نہیں ہوگی۔

جن غیر شعوری منافقین کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان کے اور عام گناہگاروں کے مابین درحقیقت صرف ایک تعبیر کا فرق ہے، ورنہ جو تضاد ان کی زندگیوں میں ہے وہی تضاد ان کی زندگیوں میں بھی ہے۔ اس بارے میں میں سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول سنایا کرتا ہوں: ”جو دم غافل سو دم کافر!“ اور ارشاد الہی ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ نہ کیا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی تو کافر ہیں۔ ہماری عدالتوں میں ہر روز نہ معلوم کتنے فیصلے قرآن و سنت کے خلاف ہو رہے ہیں۔ پورے ملک اور پوری امت مسلمہ کی سطح پر جو فیصلے ہو رہے ہیں وہ سب کے سب اللہ کی شریعت کے خلاف ہو رہے ہیں۔ قرآن کے فتوے کے مطابق تو ہم سب کے سب کافر ہیں۔ لہذا غیر شعوری منافق اور گناہگار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو فیصلہ حائل کر دی جائے گی وہ ابدی نہیں ہے، بلکہ ان میں سے بھی جن کے اندر ایمان کی کچھ رمت ہوگی ان کو بہر حال وہاں سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہاں پر صراحت کے ساتھ دروازے کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا کوئی اور محل نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس مقام پر زیادہ غور و فکر نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ اہل ایمان اُس دروازے کے ذریعے سے جنت میں داخل ہوں گے، حالانکہ اس مرحلے کی پوری تصویر جب سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فصل تو پہلے سے قائم ہو چکا ہوگا، کیونکہ جن کے پاس نور ہوگا وہ تو آگے نکل جائیں گے اور دوسرے انہیں پکارتے رہ جائیں گے کہ ذرا ٹھہرو اور پھر ان کے مابین فیصلہ قائم کر دی جائے

گی۔ فَضْرَبَ بَيْنَهُمْ میں ”ف“ تاکید کے لئے ہے۔ لہذا یہ دروازہ اہل جنت کے جنت میں داخلے کے لئے نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ دروازہ اب آئندہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں میں ایمان کی کچھ نہ کچھ رمت اور روشنی ہوگی، لیکن وہ مجموعی طرزِ عمل کے اعتبار سے اس سزا کے مستحق ہو چکے ہوں گے۔ لہذا وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر باہر نکل آئیں گے۔ یہ اہل سنت کا اجتماعی عقیدہ ہے۔

اب قرآن کریم میں کہیں اور اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہے، اسے بھی سمجھ لینا چاہئے۔ دراصل بعض چیزیں عقلی اعتبار سے اتنی بلند ہوتی ہیں کہ عام لوگوں کے سامنے ان کو بیان کرنا اُن کے لئے فتنے کا سبب بن سکتا ہے، لہذا اعلیٰ ترین فلسفیانہ مسائل کو قرآن حکیم نے بہت ہی خفیہ اور فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ سمجھنے والا سمجھ جائے گا، عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے، لیکن عام آدمی اس مقام پر سے یہ سمجھ کر گزر جائے گا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اگر یہ بات بڑے اہتمام کے ساتھ آئی ہوتی تو عام آدمی بھی رک جاتا اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتا، جبکہ اس کے اندر اس کی استعداد اور صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس میں سب کے لئے راہنمائی موجود ہے اور اس میں سب کی ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے، جبکہ دین کے بعض حقائق ایسے ہیں کہ ان کو زیادہ عام کر دیا جائے تو لوگوں میں بے عملی پیدا ہو جائے گی۔ ویسے تو یہ تصور کرنا بھی ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لئے بھی جہنم کا داخلہ کس درجے شدید اور مصائب کا ذریعہ بن جائے گا، لیکن اگر آدمی یہ سمجھ لے کہ ایمان کی کوئی رمت بھی ہوئی تو بلا آخر جہنم سے نکل جائیں گے تو اس سے خواہ مخواہ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں اور اس کے اندر عمل کا جذبہ کمزور پڑتا۔ لہذا یہ مضمون قرآن مجید میں شرح و بسط کے ساتھ نہیں آیا۔ اسی طرح سورۃ الفرقان میں ایک مقام ایسا آیا ہے کہ اس سے قرآن مجید میں عذابِ قبر کا ثبوت مل جاتا ہے، ورنہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ عذابِ قبر کا تذکرہ نہیں ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے: ﴿يُضْعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ ”دو گنا کیا جائے گا اس کے لئے عذابِ قیامت کے دن“۔ معلوم ہوا کہ

قیامت سے پہلے بھی عذاب کی کوئی شکل ہے، جب ہی تو وہ دوگنا کیا جائے گا۔
مسلمان معاشرے میں منافق کا قانونی و دستوری سٹیٹس؟

اب ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ اہل ایمان آگے نکل گئے، منافقین ادھر رہ گئے اور درمیان میں فصیل حائل ہو گئی۔ ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمُنَافِقِينَ قُلْ إِنَّهُمْ شَرُّ النَّاسِ كَيْفَ عَلِمْتُمْ فِي ذَلِكَ مَا يَكْتُبُونَ﴾ وہ انہیں پکار کر کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟“ یہ اس امر واقعہ کی تعبیر ہے کہ دنیا میں منافق اور مؤمن، گناہگار اور متقی سب گڈنڈ ہیں، سب قانونی طور پر مسلمان ہیں، بلکہ مسلمان معاشرے میں منافق اور مؤمن کے اور متقی اور فاسق کے قانونی اور دستوری حقوق بالکل برابر ہیں۔ دنیا میں ان کے مابین معاشرتی، سیاسی اور دستوری حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے کہ قانونی تقسیم تو بہر حال ایک ہی ہے، سب مسلمان شمار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں امام اعظم امام ابوحنیفہ کا موقف ہے کہ: الْإِيمَانُ قَوْلٌ لَا يَزِيدُ وَلَا يَنْقُصُ یعنی ایمان تو زبانی اقرار کا نام ہے، جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ ان کی مراد حقیقی ایمان نہیں بلکہ قانونی ایمان ہے، جو انسان کو ایک قانونی و دستوری status دیتا ہے اور وہ گھٹتا یا بڑھتا نہیں ہے، بلکہ جامد ہے۔ جبکہ حقیقی ایمان کا فیصلہ اللہ کے حضور جا کر ہوگا اور اس کا نور میدانِ حشر میں ظاہر ہوگا۔ کوئی متقی ہے تو اللہ کے ہاں اجر لے گا، فاسق ہے تو وہاں سزا بھگتے گا۔ یہاں تو مسلمان کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: ‘الْمُسْلِمُ كُفُوٌ لِّكُلِّ مُسْلِمٍ’ یعنی تمام مسلمان آپس میں مرتبہ اور سٹیٹس کے اعتبار سے بالکل ہم پلہ ہیں، قانونی اور دستوری حیثیت سب کی برابر ہے۔

میدانِ حشر میں جب چھلنی لگے گی اور حقیقی مؤمن اور محض نام کے مسلمانوں کے مابین تفریق ہو جائے گی تو یہ لوگ حقیقی اہل ایمان کو پکار پکار کر کہیں گے کہ کیا دنیا میں ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ آج تمہارے اور ہمارے مابین اتنا فرق و تفاوت کیوں ہے؟ کیا ہم بھی مسجد نبویؐ میں تمہارے ساتھ نمازیں ادا نہیں کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان میں گڈنڈ تھے۔ یہ تو جب اُحد کا موقع آیا تو معلوم ہوا کہ کون کیا ہے، جب رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی تمین سو آدمیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے واپس آ گیا۔

معلوم ہوا کہ جب تک آزمائش نہ ہو دنیا میں اصل اہل ایمان اور جھوٹ موٹ کے مسلمان کے مابین تمیز نہیں ہو سکتی۔ ورنہ تو دنیا میں وہ برابر تھے۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کی نماز جنازہ ادا کی ہے اور اس کی تدفین کے لئے اپنا کرتہ عنایت کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے بیٹے عبد اللہ ﷺ بن عبد اللہ بن ابی مؤمن صادق تھے انہوں نے آ کر درخواست کی کہ حضور! میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے، آپ اپنا کرتہ عنایت فرمادیں تو میں اسے اس کا کفن دے دوں۔ حضور ﷺ نے کرتہ عنایت فرمادیا۔ حضرت عمر ﷺ نے عرض کیا کہ حضور! آپ اس منافق کے لئے کرتہ دے رہے ہیں! آپ نے فرمایا: ”عمر! میرا کرتہ اسے خدا کے عذاب سے بچانے کے لئے ہے۔“ رسول اللہ ﷺ کی مروّت اور شرافت سے بعید تھا کہ آپ ایک مؤمن صادق کی درخواست رد کر دیتے۔ گویا مرنے کے بعد بھی قبر میں اترنے تک اسے ”مسلم“ کا لیگل ٹیٹس حاصل رہا۔

راہِ ”نفاق“ کے سنگ ہائے میل اور فتنے کی تین نسبتیں

منافقین کی پکار کے جواب میں اہل ایمان کا جواب نقل ہوا: ﴿قَالُوا بَلَىٰ﴾ ”(اہل ایمان) کہیں گے: کیوں نہیں!“ اب آگے جو الفاظ آ رہے ہیں وہ علم و معرفت اور تفقہ کا بہت بڑا خزانہ ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلَكِنَّكُمْ فَتَنًا لِّأَنفُسِكُمْ﴾ ”لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا۔“ اب اہل ایمان جواب دے رہے ہیں کہ دنیا میں تو تم ہمارے ساتھ ہی تھے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا۔

فتنے کی تین نسبتیں ہیں جنہیں اچھی طرح نوٹ کر لینا چاہئے۔ کہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تمہیں فتنے میں ڈالا۔ مثلاً: ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (العنکبوت: ۳) ”اور ہم نے فتنے میں ڈالا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے۔“ اللہ تعالیٰ اپنی طرف نسبت فرما رہا ہے کہ جو ان سے پہلے تھے انہیں بھی ہم نے فتنے میں ڈالا تھا۔ یہ ہمارا قاعدہ رہا ہے کہ ہم آزما کر ظاہر کر دیں کہ کون کھرا ہے، کون کھوٹا ہے، کون حقیقتاً

مؤمن ہے اور کون جھوٹ موٹ کا مدعی ایمان ہے۔ تو اصل امتحان اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن مکہ میں اہل ایمان کا یہ امتحان کن کے ہاتھوں آ رہا تھا؟ ابو جہل اور دیگر کفار کے ہاتھوں! تو گویا دوسری نسبت ان کفار کی طرف ہو گئی جو مسلمانوں کو ستارہ تھے اور انہیں فتنے میں ڈال رہے تھے۔ جیسا کہ سورۃ البروج میں فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ لَمَّا لَمْ يَكُونُوا لَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (آیت ۱۰) ”وہ لوگ جنہوں نے اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو فتنوں میں مبتلا کیا اور پھر اس سے توبہ نہیں کی یقیناً ان کے لئے جہنم کا عذاب اور جلائے جانے کی سزا ہے۔“ جو لوگ اہل ایمان کو آزمائشوں میں ڈالتے ہیں انہیں ستاتے اور تکالیف میں مبتلا کرتے ہیں اگر مرنے سے پہلے پہلے انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تب تو پچھلا کیا دھرا سا راعاف ہو جائے گا ورنہ ان کے لئے عذاب جہنم ہے۔

تیسری نسبت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اہل و عیال اور مال و متاع دنیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت کو اللہ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ سورۃ التغابن میں ارشاد الہی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن مِّنْ أَرْوَاحِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ يَعْتَدُونَ لَكُمْ فَأَخَذُوا هُمُومًا﴾ (آیت ۱۳) ”اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہو۔“ مزید فرمایا: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (آیت ۱۵) ”یقیناً تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے لئے) فتنہ ہے۔“ یعنی اگر تم اپنے اہل و عیال سے اللہ کی محبت کے ماتحت رہتے ہوئے محبت کرو تو ٹھیک ہے یہ بھی فطری محبتیں ہیں اور دنیوی ضرورت ہے، لیکن جہاں ان میں سے کسی ایک کی محبت بھی اللہ کی محبت سے بالا ہو گئی تو گویا تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں مبتلا کر دیا۔ یہ انسان کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ تو حقیقی اہل ایمان منافقین کو جواب دیں گے: ﴿وَلَكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ﴾ ”لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا۔“ ﴿وَتَرَبَّصْتُكُمْ﴾ ”اور پھر تم کو گمو کی

کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔

تَرْبُص کے معنی ”انتظار“ کے بھی ہیں کہ آدمی کسی جگہ پر ٹھنک کر کھڑا ہو جائے۔ کوئی تو ایسا ہوتا ہے کہ جس کی ہر چہ با داباد والی کیفیت ہوتی ہے، جبکہ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے ٹھنک کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ چلوں نہ چلوں؟ آگے بڑھوں نہ بڑھوں؟ یہ اصل میں تَرْبُص ہے۔ یہ لوگ ”تیل دیکھو تیل کی دھارد دیکھو!“ کے مصداق حالات کا انتظار کرتے ہیں کہ حالات میں کیا تبدیلی آتی ہے۔ تمام صورتوں کو دیکھ بھال کر دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھتے ہوئے اچھی طرح سوچ سمجھ کر ”سنجھل کر اور بچ بچ کر چلتے ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ﴾ (الحج: ۱۱) ”لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے کنارے کنارے“۔ یہ لوگ منجد ہار میں نہیں کودنا چاہتے۔ ﴿فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ﴾ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ﴾ ”پھر اگر اسے کوئی خیر پہنچے تو اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش (تکلیف) پہنچے تو اپنے چہرے کے بل واپس پلٹتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت (دونوں) کا خسارہ اٹھایا“۔ یعنی یہ لوگ بچ بچ کر اور کنارے کنارے چلنا چاہتے ہیں، منجد ہار میں نہیں جانا چاہتے۔ اگر بس خیر رہے تو مطمئن ہیں اور اگر کہیں کوئی امتحان آ گیا، آزمائش آگئی تو اوندھے خنہ گر پڑتے ہیں۔ ان کے اس طرز عمل کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ دنیا اور آخرت دونوں کے خسارے کا سودا ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا کہ جب تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا اور مال و اولاد اہل و عیال، علاق و دنیوی، جائیداد پر وفیشنز، ان تمام چیزوں کی محبت تم پر غالب آگئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم تَرْبُص اور گومو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے کہ آگے بڑھیں یا نہ بڑھیں! کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے! یہ حقیقت ہے کہ انسان کے اندر نیکی کا جذبہ بھی موجود ہے، لیکن وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ بقول غالب۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

منافقین کی اس کیفیت کے لئے سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ

ذَلِكَ ﴿ کہ یہ مذذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور سورۃ التوبہ میں فرمایا: ﴿فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَسْرَدُونَ﴾ ”وہ اپنے شکوک و شبہات میں متردد ہو کر رہ گئے“۔ یہاں آگے فرمایا: ﴿وَارْتَبْتُمْ﴾ ”اور تم شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے“۔ یعنی اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ ایمان کی جو پونجی تمہیں نصیب ہوئی تھی اس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چھینے شروع ہو گئے کہ ہم اپنا سب کچھ یہاں کھپادیں اور معلوم نہیں کہ اس کا کچھ بدلہ بھی ملے گا یا نہیں! پتہ نہیں آخرت ہوگی بھی یا نہیں۔ یقین تو نہیں ہے کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اس لئے کہ یہ سارا ادھار کا سودا ہے۔ جیسے سورۃ التوبہ میں فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ”اہل ایمان سے اللہ نے ان کے مال اور جانیں خرید لئے ہیں جنت کے عوض“۔ جنت تو ملے گی آخرت میں یہاں تو نہیں ملے گی۔ یہ تو ادھار کا سودا ہے اور ادھار کے سودے پر آدمی کچھ نہ کچھ تو متردد ہوتا ہے۔ اگر نقد سودا ہو تو ٹھیک ہے کہ ہاتھ سے ایک چیز دی اور دوسری لے لی مبادلہ فوراً ہو گیا، لیکن یہ تو ادھار کا سودا ہے۔ تو اس تَرَبُّص کے نتیجے میں ایمان کی پونجی برف کی طرح پگھلنا شروع ہو گئی۔

اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کے سبب جو تَرَبُّص پیدا ہوتا ہے اس حوالے سے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ بڑی اہم ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

”(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے باپ، اپنے بیٹے، اپنے بھائی، اپنی بیویاں، اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے (اور جمع کئے) ہیں، اور وہ کاروبار جن کے کساد (اور مندے) کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے (جو بڑی مشقت سے تم نے جمائے ہیں) اور وہ رہائش گاہیں (جائیدادیں) بلڈنگیں، حویلیاں اور کوٹھیاں (جو تمہیں بڑی پسند ہیں) (یہ آٹھ چیزیں) اگر محبوب تر ہیں (تین چیزوں سے) اللہ سے، اللہ کے رسول سے اور اللہ کی راہ

میں جہاد کرنے سے، تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ (عذاب) لے آئے اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

یہ گویا ایک ترازو ہے جسے ہر شخص اپنے باطن میں نصب کر لے۔ ایک پلڑے میں آٹھ چیزیں ڈالیں جن میں سے پانچ علاقے دُنیوی ہیں، یعنی باپ، بیٹا، بھائی، بیوی اور رشتہ دار۔ باقی ہر انسان تو اس کے بعد ہی آتا ہے۔ اور تین چیزیں دُنیوی مال و اسباب میں سے ہیں، نقد مال و دولت، کاروبار اور اثاثہ جات یعنی بلڈنگ یا جائیداد وغیرہ۔ اور ترازو کے دوسرے پلڑے میں تین کی محبت ڈالیں، یعنی اللہ کی محبت، رسول کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت۔ پھر دیکھیں کہ کون سا پلڑا بھاری ہے! اگر یہ آٹھ والا پلڑا بھاری ہے تو اس صورت میں ’فَتَسْرَبُصُوا‘ جاؤ، انتظار کرو! یہ وہی لفظ تَوْبُصُ ہے جو زبردست آیت میں ہے۔ اب تَوْبُصُ اور گوگلو کی کیفیت تو لازماً ہوگی کہ چلوں نہ چلوں۔ اس آیت میں مذکور علاقے دُنیوی کو اقبال نے ایک شعر میں جمع کیا ہے۔

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند

بتان وہم و گماں، لا الہ الا اللہ!

جان لیجئے کہ یہ تَوْبُصُ اور اِدْتِیَابِ ایک دن میں نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ رفتہ رفتہ اور تدریجاً پساؤ کی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ آدمی ایمان سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ جیسے سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ”یہ اس لئے ہوا کہ وہ پہلے ایمان لے آئے، پھر کفر میں چلے گئے“۔ یا یہ کہ ایمان اتنا کمزور رہ جاتا ہے کہ وہ عمل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس صورت میں پھر عمل میں تناقض اور تضاد ہوتا ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ جیسے سورۃ الصف کی آیت ۲ میں فرمایا گیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ ”اے اہل ایمان! وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو“۔ یعنی قول و فعل میں تضاد۔

خوشنما عقائد و خواہشات، شیطان کی پُر فریب چالیں

آگے فرمایا: ﴿وَعَسْرَتْكُمْ اٰمَانِيٌّ﴾ ”اور تمہیں آرزوؤں نے دھونسنے میں

ڈالے رکھا۔ یہ چوتھا مرحلہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کچھ من گھڑت اور خوشنما عقائد سے بہلاتا ہے۔ امانی لفظ اُمْنِيَّة کی جمع ہے اور اسی مادے سے لفظ ”تمنا“ بنا ہے، یعنی خواہشات، آرزوئیں۔ انگریزی میں انہیں ”wishful thinkings“ کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں یہود کے عقائد میں موجود ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے: ﴿سَيُغْفَرُ لَنَا﴾ ”عنقریب ہمیں معاف کر دیا جائے گا“۔ اللہ ہمیں بخش دے گا، وہ بخشہا رہے، ہمیں تو بخش ہی دیا جائے گا۔ ہم میں سے بھی ایک گروہ ہے جو کہتا ہے آخر کچھ بھی ہیں کلمہ گو ہیں کچھ بھی ہیں محمد ﷺ کے نام لیوا تو ہیں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے: ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اِيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ ”ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن“ اور ﴿لَنَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُ هُ﴾ ”ہم تو (گویا) اللہ کے بیٹے اور اس کے بڑے چہیتے ہیں“۔ آخر ہم ابراہیم کی نسل سے ہیں، تو کیا اللہ تعالیٰ ابراہیم کا کچھ بھی لحاظ نہیں کرے گا؟ جس کو کہ اللہ نے اپنا دوست کہا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ ”اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنا لیا“۔ تو کیا اللہ اپنے دوست کی اولاد کی کوئی فکر نہیں کرے گا؟ ہمارے ساتھ عام لوگوں والا معاملہ نہیں ہوگا، بلکہ خاص معاملہ ہو گا۔ تو یہ سب ان کی امانی ہیں۔ قرآن جہاں کہیں ان کے عقائد نقل کرتا ہے تو ساتھ ہی فرماتا ہے: ﴿تِلْكَ اَمَانِيْهُمْ﴾ کہ یہ ان کی wishful thinkings ہیں، یہ ان کے من گھڑت خیالات ہیں۔ ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ”(اے نبی! ان سے) کہئے کہ لاؤ دلیل اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو“۔ کہیں تورات میں اللہ نے یہ گارنٹی تمہیں دی ہے؟ تو یہ انسان کی امانی اور من گھڑت عقائد اسے طفل تسلیاں دیتے ہیں۔

آخری بات یہ فرمائی: ﴿حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ﴾ ”یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا“۔ یہ وہی الفاظ آگئے ہیں جو سورۃ التوبہ کی آیت ۲۳ میں ہیں: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى ئٰتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهِ﴾ ”جاؤ، انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے“۔ یعنی یہ جو حق و باطل کی کشمکش ہو رہی ہے اس کے ضمن میں اللہ کا فیصلہ آ جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا

فیصلہ موت بھی ہے اللہ کا فیصلہ قیامت بھی ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَعَرَّكُمْ بِاللَّهِ
 الْغُرُورُ﴾ اور وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا
 رہا۔ یہاں نوٹ کیجئے کہ یہ لفظ 'غُرور' 'غ' کے زبر (ۛ) کے ساتھ ہے اور یہ فُعال
 کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے جس کا مطلب ہے بہت بڑا دھوکے باز۔ اس کے علاوہ
 ایک لفظ 'غُرور' ہے جو 'غ' کے پیش (ۛ) کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم اردو میں بھی غُرور کا
 لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اسے بڑا غُرور ہے۔ اور مغرور اس سے اسم الفاعل ہے۔ تو
 فرمایا جا رہا ہے کہ "تمہیں خوب دھوکہ دیا اس بہت بڑے دھوکے باز نے"۔ اس سے
 شیطان لعین مراد ہے۔ یہ شیطان لعین بھی انسان کو مزید لوریاں دے دے کر سلاتا ہے۔
 اور اس کی لوری یہ ہے کہ اللہ بڑا غفور ہے، وہ کہاں سزا دے گا! وہ تو لوگوں کو ایسے ہی
 ڈرانے کے لئے کہتا ہے تاکہ وہ سیدھے ہو جائیں۔ ورنہ کیا ماں اپنی اولاد کو اپنے
 ہاتھوں جہنم میں ڈال سکتی ہے؟ تو جو خالق و مالک ہے وہ یہ کیسے کر سکتا ہے! یہ تو صرف
 کہنے کی باتیں ہیں ہونے والی باتیں نہیں ہیں! یہ عقائد ہمارے ہاں بھی ملنگ قسم کے
 صوفیوں میں موجود ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کا صرف ڈراوا ہی
 ہے، وگرنہ ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ تو بڑا کریم ہے، بڑا نکتہ نواز اور بندہ نواز ہے، وہ بڑا ہی غفور
 اور رحیم ہے، لہذا اس کے بارے میں یہ گمان نہ کرو کہ وہ تمہیں عذاب دے گا۔ سورۃ
 الانفطار پوری کی پوری ان کے اسی عقیدے کی تردید میں ہے۔ فرمایا: ﴿يَأْتِيهَا الْإِنْسَانُ
 مَا عَمَرَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾ "اے انسان! کس شے نے تجھے دھوکہ دیا ہے اپنے
 رب کریم کے بارے میں؟" وہ کریم بھی ہے اس میں کوئی شک نہیں، لیکن وہ عزیز
 ذوا انتقام (انتقام لینے میں سخت) بھی ہے۔ وہ تمہارے بھی ہے، وہ شدید العقاب (سخت
 سزا دینے والا) بھی ہے۔ اس کی تو تمام شانیں ہیں اور ان تمام شانوں کو اپنے سامنے
 متحضر رکھنا ضروری ہے۔

بإذن اللہ ولی و لکرم فی القرآن العظیم و نفعنی وایاکم بالایات و الذکر الحکیم

(ترتیب و تسوید: طارق اسماعیل ملک)

قرض کے معاملہ کی سنگینی

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ أَتَى بِجَنَازَةٍ فَقَالُوا صَلَّى عَلَيْهَا فَقَالَ: ((هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ؟)) قَالُوا لَا، فَصَلَّى عَلَيْهَا، ثُمَّ أَتَى بِجَنَازَةٍ أُخْرَى، فَقَالَ: ((هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ؟)) قِيلَ نَعَمْ، قَالَ: ((فَهَلْ تَرَكَ شَيْئًا؟)) قَالُوا ثَلَاثَةُ دَنَانِيرٍ، فَصَلَّى عَلَيْهَا، ثُمَّ أَتَى بِالثَّلَاثَةِ، فَقَالَ: ((هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ؟)) قَالُوا ثَلَاثَةُ دَنَانِيرٍ، قَالَ: ((هَلْ تَرَكَ شَيْئًا؟)) قَالُوا لَا، قَالَ: ((صَلُّوا عَلَيَّ صَاحِبِكُمْ)) قَالَ أَبُو قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: صَلَّى عَلَيْهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَعَلَى دِينُهُ، فَصَلَّى عَلَيْهِ..... (صحيح البخارى، كتاب الحوالات، باب ان احال دين

الميت على رجل جاز)

حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ایک جنازہ لایا گیا اور عرض کیا گیا کہ حضور! اس کی نماز جنازہ پڑھا دیجئے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ”کیا اس آدمی پر کچھ قرض ہے؟“ لوگوں نے عرض کیا کہ کچھ قرض نہیں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جنازہ کی نماز پڑھا دی۔ پھر ایک دوسرا جنازہ لایا گیا، اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”اس میت پر کسی کا قرضہ ہے؟“ عرض کیا گیا کہ ہاں اس پر قرض ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ”کیا اس نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے (جس سے قرض ادا ہو جائے)؟“ لوگوں نے عرض کیا کہ اس نے تین دینار چھوڑے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں بھی دریافت فرمایا: ”کیا اس نے مرنے والے پر کچھ قرضہ ہے؟“ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں اس پر تین دینار کا قرضہ ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا: ”اس نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے

(جس سے قرض ادا ہو سکے)؟“ لوگوں نے عرض کیا کچھ نہیں چھوڑا تو آپ نے حاضرین صحابہؓ سے فرمایا: ”اپنے اس ساتھی کی نماز جنازہ تم لوگ پڑھ لو“۔ تو حضرت ابو قتادہ انصاریؓ نے عرض کیا: حضور! اس کی نماز پڑھا دیں اور اس پر جو قرضہ ہے وہ میں نے اپنے ذمہ لے لیا (میں ادا کروں گا) تو اس کے بعد آپ نے اس کی جنازہ کی نماز بھی پڑھا دی۔“

بعض اوقات انسان کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس کے لئے ناگزیر ضرورت کے تحت قرض لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ ایسے ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے قرضہ دینا بہت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ اور اگر وہ حالات سے مجبور ہو تو اسے فراخی تک مہلت دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور اگر اس کے فقر و فاقہ، غربت اور ناداری کے پیش نظر قرض کی رقم معاف ہی کر دی جائے تو ایسے شخص کو رسول اللہ ﷺ نے خوشخبری دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا۔ اسی طرح قرض کے معاملے کے آداب بھی بتائے گئے ہیں کہ فریقین قرض کی دستاویز تحریر کریں جس میں قرض کی رقم، واپسی کی میعاد اور جملہ شرائط کا ذکر ہو اور اس تحریر پر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بھی ٹھہرایا جائے۔

مگر جہاں ضرورت مند کو قرض دینے کی ترغیب دی گئی ہے وہاں قرض لینے کی سخت حوصلہ شکنی کی گئی ہے، کیونکہ قرض ایک بوجھ ہے جسے ادا کئے بغیر انسان کا چھٹکارا نہیں۔ یہ قرض خواہ کا حق ہے جو بہر حال اسے دلویا جائے گا۔ پس حتی الوسع قرض لینے سے گریز کرنا چاہئے اور اگر کوئی سخت مجبوری پیش آ جائے اور قرض لینا ضروری ہو جائے تو اپنے وسائل کا جائزہ لے کر اتنی ہی رقم قرض یعنی چاہئے جس کی واپس ادائیگی ممکن نظر آ رہی ہو۔ قیامت کے دن جب حساب کتاب ہوگا تو ہر حق دار کو اس کا حق دلویا جائے گا۔ جس شخص کے ذمہ کسی کی رقم ہوگی وہ اسے کیسے ادا کرے گا، کیونکہ وہاں کسی کے پاس درہم و دینار تو نہیں ہوں گے۔ ایک حدیث کے مطابق قرض خواہ کو مقروض کے نیک اعمال کا ثواب دے کر راضی کیا جائے گا اور یہ وہ وقت ہوگا جب ہر کسی کو اپنے نیک

اعمال کے ثواب کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر مقروض کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو قرض خواہ کے گناہ بقدر قرضہ قرض دار کے کھاتہ میں ڈال دیئے جائیں گے۔

یہی مطلب ہے اس مشہور حدیث کا جس میں اُمت کا مفلس اُس شخص کو کہا گیا ہے جس نے نیکی کے بہت سے کام کئے مگر لوگوں کے حقوق بھی تلف کئے۔ حساب کے دن جب لوگ اس سے مطالبے کریں گے اور وہ ادائیگی نہ کر سکے گا تو اس کی نیکیاں لوگوں کو دلوائی جائیں گی، یہاں تک کہ اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی مگر حق دار ابھی موجود ہوں گے۔ اُس وقت حق داروں کے گناہ اس شخص کے ذمہ ڈال کر انہیں راضی کیا جائے گا۔ ایسا شخص ڈھیروں نیکیوں کے باوجود جنت میں نہ جاسکے گا، کیونکہ اس نے حقوق العباد کے سلسلہ میں احتیاط سے کام نہ لیا ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ حقوق العباد کا معاملہ انتہائی سنگین ہے۔ اور قرض کا لین دین حقوق العباد کی ایک واضح صورت ہے جس میں قرضے کی عدم واپسی مقروض کی نجات کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جائے گی۔

قرض کے معاملہ کی سنگینی کے پیش نظر نبی رحمت ﷺ جنازہ پڑھانے سے پہلے دریافت کرتے تھے کہ اس شخص کے ذمہ کسی کا قرضہ تو نہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص کا جنازہ لایا گیا، آپ ﷺ نے حسب معمول دریافت فرمایا کہ اس کے ذمہ قرض ہے؟ جب بتایا گیا کہ نہیں تو آپ ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا تو آپ ﷺ کے استفسار پر بتایا گیا کہ اس پر قرضہ تو ہے مگر وہ اس کی ادائیگی کے بقدر رقم بھی چھوڑ گیا ہے تو بھی آپ ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر جب تیسرا جنازہ لایا گیا تو وہ ایسے شخص کا تھا جس کے ذمہ قرض تھا اور وہ اس قرض کی ادائیگی کے بقدر مال بھی نہیں چھوڑ گیا تھا تو آپ نے اس کا جنازہ پڑھانے سے گریز کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ تم خود ہی اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو۔ اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے مرنے والے کے ذمہ قرض کی رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی تو آپ نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھا دی۔

اس واقعے سے قرض کی ذمہ داری کے بوجھ کی سنگینی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس موضوع کی تائید میں رسول اللہ ﷺ کے بیشتر فرمودات ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہید ہونے والے مردِ مؤمن کے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں سوائے قرض کے۔ صاف ظاہر ہے کہ قرض تو بندے کا حق ہے، وہ تو بندہ ہی معاف کرے گا اور قیامت کے دن جب ماں، باپ، بھائی، بیٹا اور بیوی بھی کام نہ آئیں گے، ہر ایک کو اپنی اپنی فکر دامن گیر ہوگی اس موقع پر کون اپنا حق چھوڑے گا؟

اسی طرح جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مؤمن بندہ کی روح اس کے قرضہ کی وجہ سے معلق اور رکی رہتی ہے جب تک وہ قرضہ ادا نہ کر دیا جائے جو اُس کے ذمہ ہے“۔ سنن ابی داؤد میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ان کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے (جیسے شرک، زنا وغیرہ)“ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور وہ اس کی ادائیگی کا سامان چھوڑ نہ گیا ہو“۔

حضرت محمد بن عبد اللہ بن حشیشؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، اگر کوئی آدمی راہِ خدا میں شہید ہو اور وہ شہادت کے بعد پھر زندہ ہو جائے، پھر جہاد میں شریک ہو اور اس کے بعد پھر زندہ ہو جائے، اور پھر راہِ خدا میں شہید ہو اور پھر زندہ ہو جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو تو وہ جنت میں اُس وقت تک نہ جاسکے گا جب تک اس کا قرض ادا نہ ہو جائے“۔

زیر درس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کا جنازہ پڑھانے سے گریز کیا جس کے ذمہ قرض تھا۔ بعد ازاں جب افلاس و ناداری کا دور ختم ہو گیا تو آپ ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ اگر کوئی مسلمان اس حالت میں انتقال کر جائے کہ اس پر قرض ہو (اور

اس نے ادائیگی کے لئے کوئی سامان بھی نہ چھوڑا ہو) تو وہ قرض میرے ذمہ ہے، میں اس کو ادا کروں گا۔ ظاہر ہے یہ آپ ﷺ نے اس لئے فرمایا کہ آپ کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ کوئی مسلمان قرض کا بار لئے ہوئے دایر فانی سے رخصت ہو اور یہ قرض اُس کی بخشش کے راستے میں رکاوٹ بن جائے۔

اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی پیش نظر رہے کہ جو آدمی لوگوں سے ادھار لے اور اس کی نیت ادا کرنے کی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ادا کر دے گا۔ پس عافیت اسی میں ہے کہ قرض لینے سے حتی الوسع گریز کیا جائے اور اگر کہیں شدید ضرورت کے تحت قرض لینا پڑے تو جلد واپسی کی نیت کرے اور جو نہی وسعت ملے فوراً ادا کر دے۔ دوسری طرف مقروض کو مہلت دینے کی فضیلت پر بھی نگاہ رکھے اور مقروض کے ساتھ نرمی کا سلوک کر کے مالک یوم الدین سے رحمت اور نجات کی امید رکھے۔ لواحقین اور وارثوں کے لئے بھی یہ اشد ضروری ہے کہ اگر مرنے والے کے ذمہ قرض کی رقم ہو تو وہ اس کی فوری ادائیگی کا انتظام کر کے اس کی حقیقی خیر خواہی کا ثبوت دیں۔



قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

میثاقِ حکمتِ قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیمِ اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

اگر رسول اللہ ﷺ اس زمانے میں ہوتے!

تحریر: مولانا محمد منظور نعمانی

فرض کیجئے اگر رسول اللہ ﷺ اس زمانے میں ہوتے اور کسی قابل اعتماد اور باوثوق ذریعہ سے ہم کو معلوم ہوتا کہ فلاں دن اور فلاں جگہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نہایت اہم پیغام سنانے والے ہیں جس میں ہدایت و ضلالت اور نجات و ہلاکت کے راستوں کو صاف صاف بیان کر کے قیامت تک آنے والے بندوں پر اللہ کی حجت تمام کر دی جائے گی اور مقدس رسول کی زبانی اللہ پاک کا یہ آخری پیغام ہوگا جس کے بعد ہم کوئی الہی پیغام اور رسول خدا کا کوئی جدید بیان نہیں سن سکیں گے۔ اور اس مقررہ و مشہورہ مقام پر پہنچنا بھی ہمارے لئے باسانی ممکن ہوتا اور اس تاریخ کے آنے میں ابھی اتنے دن بھی باقی ہوتے کہ اس سرکاری پیغام کی اصلی زبان اگر ہم نہ جانتے ہوتے تو اس کا سیکھ لینا بھی اس عرصہ میں ہمارے لئے ممکن ہوتا جس کے بعد ہم اس پیغام کو اس کی اصلی اسپرٹ میں پوری طرح سمجھ سکتے اور پھر اس کے سیکھنے کے وسائل بھی ہم کو میسر ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اس زبان کے سیکھنے کی کوئی کوشش نہ کرتے اور جب وہ مبارک دن آجاتا تو اللہ کے اس نہایت اہم پیغام اور رسول اللہ ﷺ کے اس آخری بیان کو سننے یا بعد کو بالواسطہ ہی اس سے واقفیت حاصل کرنے کا خیال بھی ہمارے دل میں نہ آتا اور اس کی طرف ہم کوئی توجہ ہی نہ کرتے تو کیا دنیا کی کوئی عقل بھی ہمارے اس طرز عمل کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتی تھی کہ ہمارے دلوں میں اللہ و رسول کی کوئی عظمت و وقعت اور ہماری نظروں میں ان کے پیغاموں کی کچھ بھی قدر و قیمت ہے؟ کوئی دوسرا کچھ کیوں کہے! آپ ہی خوب سوچ سمجھ کر اپنے دلوں سے اس کا جواب لیجئے!

اچھا اگر آج کسی شخص کے متعلق آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس نے اللہ و رسول اور ان کے مقدس پیغاموں کی طرف سے اتنی ہی بے اعتنائی اور ایسی ہی لاپرواہی اختیار کر رکھی ہے تو کیا اس کے بعد بھی دولتِ ایمان و ایقان سے اس کی محرومی میں آپ کو کچھ شک و شبہ ہوگا؟

سوال کی جو صورت سطور بالا میں آپ کے سامنے رکھی گئی ہے کیا یہ محض فرضی ہے؟ بے شک رسول اللہ ﷺ اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز نہیں ہیں، لیکن اللہ پاک کا جو آخری فیصلہ کن پیغام اس کے آخری رسول، حضرت محمد عربی ﷺ (فداہِ اُمی و ابی) لے کر آئے تھے وہ بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے آج ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر جانے پر بھی اپنی اسی شانِ جلالی و جمالی اور اسی شادابی و تازگی کے ساتھ موجود ہے، ہمارے گھروں میں اس کی کئی کئی کاپیاں اور کئی کئی نسخے رکھے ہوئے ہیں — اب ہم جس وقت چاہیں خداوندِ قدوس کے اتارے ہوئے اور مقدس رسول کے لائے ہوئے اس ”پیغامِ ہدایت“ کو بالکل اسی کے اصلی لفظوں میں دیکھ سکتے ہیں، پڑھ سکتے ہیں، اور اگر ہمیں تھوڑی سی بھی عربی آتی ہو تو خود اس کا مطلب و منشا سمجھ سکتے ہیں، اور کسی درمیانی واسطہ کے بغیر اس سے براہِ راست ہدایت حاصل کر سکتے ہیں، اللہ کی رضامندی اور فلاحِ دُنویٰ اور اُخرویٰ کے طریقے اس سے دریافت کر سکتے ہیں — گویا یوں سمجھئے کہ نہایت پیاری اور بے حد شیریں عربی زبان بولنے والا اور عربی مبین ہی میں خدا کا ”پیغامِ ہدایت“ سنانے والا ایک زندہ جاوید پیغمبر (بشکلِ قرآن) ہمارے گھروں میں آج بھی موجود ہے۔

لیکن ہمارا برتاؤ اس کے ساتھ کیا ہے؟ — کتنے ہم میں ہیں جو اس سے ہدایت تعلق رکھتے ہیں؟ — کتنے ہیں جو اس سے اچھی طرح فیض حاصل کرنے کے لئے اور اس کو براہِ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان سیکھ چکے ہیں یا سیکھ رہے ہیں؟ اور کتنے ہیں جو عربی زبان نہ جاننے اور اس کے لئے کوئی ذریعہ بھی نہ پاسکنے کی مجبوری سے کسی

اور ترجمہ یا تفسیر کی روشنی میں یا درس قرآن کے کسی حلقہ میں شریک ہو کر ہی اس کی
 بات سمجھنے کی اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے لئے اپنے
 وقت کا کچھ حصہ صرف کرتے ہیں؟

ذرا ہندوستان "ہی" کے "نو کروڑ مسلمانوں" پر اس جہت سے ایک نظر تو ڈالئے
 اور سوچئے کہ کتنی گہرائی ہے ان کے ایمانی دعوؤں میں اور کتنا تعلق ہے ان کو اللہ و رسول
 اور ان کے پیغاموں سے؟

اللہ کے بندو! رسول کی محبت کا دم بھرنے والو! اور قرآن کی عظمت و تقدیس کی
 قسمیں کھانے والو! اللہ و رسول کے اس مقدس پیغام (قرآن) کے ساتھ یہ بے اعتنائی
 اور یہ لاپرواہی!

کیا خدا کے سامنے اپنے اس تغافل مجرمانہ کی تم جواب دہی کر سکو گے؟ اور کیا عذر
 ہوگا تمہارا اس وقت جب رب العزت کے تخت جلال کے سامنے اس کا رسول فریادی
 بن کر درو و حسرت کے ساتھ کہتا ہوگا:

﴿يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا﴾ ❁
 "اے میرے خداوند! میری اس قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ رکھا تھا۔"

قرآن پاک کے ساتھ مسلمانوں کے معاملہ پر اگر آپ طبقہ وار نظر ڈالیں تو
 دیکھیں گے کہ "مسلمان" کہلانے والی امت میں ایک بہت بڑی بلکہ خارج از حد و شمار
 تعداد تو ان قطعاً نا تعلیم یافتہ سب سے نیچے کے طبقہ کے عوام کی ہے جن بے چاروں کو
 کبھی قرآن مجید کی ہوا بھی نہیں لگی۔

پھر ان سے کچھ کم تعداد میں دوسرے درجہ کے وہ عوام ہیں جنہوں نے کبھی بچپن
 میں کسی پرانے طرز کے مکتب میں بیٹھ کر یا کسی "حافظ جی" سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا تھا

افسوس کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مسلمانوں کی صورت حال بھی اس اعتبار سے پاکستان کے
 مسلمانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

لیکن اس کے بعد کبھی اس کو کھول کر دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی، بجز اس کے کہ محلہ برادری میں کبھی کبھار کوئی مرجاتا ہو اور پڑوس یا قرابت کے خیال سے اس کے ”تیجے“ میں ایک آدھ پارہ پڑھنا پڑ جاتا ہو۔ پھر وہ بھی اپنے لئے نہیں بلکہ اس مرجانے والے کو ”بخشنے“ کے لئے، بلکہ فی الحقیقت تو اکثر و بیشتر صرف محلہ یا برادری کا ”حق“ اتارنے ہی کے لئے۔ تو اس طبقے کا تعلق ”قرآن مجید“ سے بس کسی کی موت اور تیجے ہی کا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اس قسم کے لوگوں سے کچھ کم تعداد میں کچھ ایسے نیک لوگ بھی ہیں جو ”حصولِ ثواب و برکت“ کی خاطر کبھی کبھی یا روزمرہ قرآن مجید کے پارہ دو پارہ کی تلاوت تو کرتے ہیں اور بڑی خوش اعتقادی سے کرتے ہیں، مگر بیچارے اس کے مطلب و مقصد سے قطعاً نا آشنا ہیں، کیونکہ عربی جو اس کی زبان ہے اس سے واقف نہیں اور جس زبان میں پڑھنا لکھنا وہ جانتے ہیں، مثلاً اردو، تو اگرچہ اس میں اب بہت سے ترجمے اور تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور ایک اردو دان ان کی مدد سے بھی قرآن مجید کے مطلب و مقصد سے اچھی خاصی حد تک آشنا ہو سکتا ہے، لیکن ان بیچاروں کے ذہن میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور اپنی عملی زندگی کے لئے اس سے ہدایت لینا بھی کوئی بہت ضروری بات ہے، اس لئے مدت العروہ بس تلاوت ہی کا ثواب حاصل کرنے پر قانع رہتے ہیں، گویا کہ قرآن مجید بس ان کی تلاوت ہی کے لئے نازل ہوا ہے اور اس سے زیادہ اس کا کوئی مطالبہ ان سے نہیں ہے۔ اسی واسطے قرآن پاک کے مطالب و مقاصد سے واقفیت حاصل کرنے کا کوئی داعیہ کبھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔

رہا جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو باسٹنائے شواذ اس کی غالب ترین اکثریت نے دین کے تمام ہی علمی و عملی شعبوں سے جیسی کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے، اور جو حیات دنیا ہی کی کامرانیوں کو محض نظر بنا کر ارشادِ ربانی:

﴿إِنَّ الدِّينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا﴾

وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غفلُونَ ﴿۸۷﴾ أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ لِقَاؤُنَا
يَكْسِبُونَ ﴿۸۸﴾ (یونس: ۸۷)

”لاریب‘ جو لوگ (موت کے بعد عالم آخرت میں) ہماری لقا (یعنی دربارِ خداوندی میں حاضری اور پیشی) کے امیدوار نہیں ہیں اور حیاتِ دنیا ہی سے خوش اور اس میں مگن ہیں اور جو ہماری آیتوں سے غفلت و بے پروائی برتتے ہیں ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگا اپنی بدکرداریوں کے بدلے۔“

کا ہو بہو مصداق ہو گیا اس کو قرآن پاک بلکہ خود قرآن نازل کرنے والے اور اس کے لانے والے (اللہ و رسول) کے ساتھ جیسی کچھ دلچسپی ہے وہ ہر واقف حال کو معلوم ہے۔ ان تمام طبقات کی بہ نسبت محدود اور قلیل التعداد ایک گروہ ”باضابطہ علمائے کرام“ کا بھی ہے جو اپنی اس قلت کے باوجود بھی ہزاروں سے متجاوز اور لاکھوں کے شمار میں ہوگا۔ ان حضرات نے برسہا برس دینی مدرسوں میں گزار کے عربی زبان سیکھی ہے اس کی صرف و نحو تک پر آٹھ آٹھ دس دس کتابیں پڑھی ہیں معانی اور بیان و بدیع میں بھی کم از کم ”تلخیص المفتاح“ اور ”مختصر المعانی“ تو ضرور ہی ان کے زیر درس رہی ہوں گی فقہ اور حدیث کی بہت سی کتابوں پر بھی انہوں نے عبور حاصل کیا ہے قرآن کی تفسیر کے نام سے بھی کم از کم ایک کتاب ”جلالین“ تو سبقاً سبقاً پڑھی ہی ہوگی اور اگر خوش نصیبی سے تعلیم کسی بڑے ”دارالعلوم“ میں ہوئی ہے تو شاید ”بیضاوی“ و ”مدارک“ کا کچھ حصہ بھی زیر درس رہا ہو اس لئے قرآن پاک میں تدبر و تفکر اور اس کی ہدایات سے براہ راست استفادہ کم از کم ان کا تو شغلِ حیات ہی ہونا چاہئے اور ان کے متعلق تو یہ امید بجا اور درست ہی ہونی چاہئے کہ اللہ کی اس کتابِ عظیم سے ان کا تعلق بڑا گہرا ہو گا اور یہ خوش نصیب حضرات تو قرآن حکیم کی تلاوت بالکل اس طرح اور اس تصور کے ساتھ کرتے ہوں گے کہ ان کے سامنے گویا ایک پیغمبر ہے جو خدا کی غیر مشکوک وحی ان کو شہارہا ہے اور وہ اپنے سینے کے کواڑ کھول کے اس کے سامنے اس کا درس سننے اور اس پر عمل پیرا ہونے ہی کے لئے بیٹھے ہیں۔

مگر آہ کہ یہاں بھی یہ امید بڑی حد تک پامال ہی ہے۔ مستثنیات کو چھوڑ کر (جن کا شمار غالباً پانچ فیصد بھی نہ ہوگا) اس طبقہ علماء کا عام حال بھی اس باب میں دوسروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہاں بھی قرآن مجید کی عموماً ”تلاوت“ ہی کی جاتی ہے اور ”کتاب ہدیٰ“ و ”موعظہ و ذکرئی“ ہونے کی اس کی جو اصل حیثیت تھی وہ یہاں بھی عموماً کم از کم عملاً تو فراموش ہی کر دی گئی ہے۔ حالانکہ خود اس کا نازل کرنے والا اسی میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ ”یہ کتاب اس واسطے بھیجی جا رہی ہے کہ تم غور و تامل سے اس کی باتیں سنو اس کے احکام کو سمجھو اور اس سے ہدایت و نصیحت حاصل کرو“۔

﴿كُنْتُمْ أَنْزَلْنَاهُ الْكِتَابَ مُبْرَكًا لِيَذَّبَرُوا أَيْتَهُ وَيَلْتَدَكَّرُوا لَوْا
الْأَلْبَابِ﴾ (ص: ۲۹)

” (یہ قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے اسی لئے تجھ پر نازل کیا ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور کریں اور اصحاب عقل و دانش اس سے نصیحت لیں۔“ اور جو لوگ آیات قرآن کو سمجھ بوجھ کر اس سے ہدایت و نصیحت حاصل نہیں کرتے ہیں ان کے متعلق ارشاد ہے:

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ۲۴)

”کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں؟“

وا اسفاہ! اللہ پاک تو ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن پاک کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور ذرا گوش دل سے سنو! کیسی پیاری اس کی یہ صدا ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ﴾ (القمر: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

”ہم نے نصیحت کے واسطے قرآن کو آسان کیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت لینے والا؟“

لیکن ہم نے شاید یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جہاں تک دینی ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے اس کے لئے تو دوسرے وسائل (مثلاً بزرگانِ کرام اور پیرانِ عظام) ہی کافی ہیں اور قرآن تو بس ”ثواب تلاوت“ حاصل کرنے کے لئے گویا ”وظیفہ“ کی ایک کتاب ہے۔

حتیٰ کہ نماز میں قرآن پاک جو پڑھا جاتا ہے تو عام خیال اُس کے متعلق بھی یہی ہو گیا ہے کہ بس صحت حروف کے ساتھ ”قراءت“ ہو جانی چاہئے اسی لئے پوری توجہ الفاظ کے سنوار اور اتار چڑھاؤ نیز آواز میں جاذبیت و دلکشی پیدا کرنے پر تو صرف کی جاتی ہے، مگر اُن الفاظ کے ذریعہ جو کچھ ہدایت قرآن مجید دینا چاہتا ہے اور یہ الفاظ جس کے لئے بس ایک حسین اور مقدس پیرہن اور بہترین واسطہ تبلیغ کی حیثیت رکھتے ہیں اس کی طرف دھیان دینے کی مطلق ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ گویا جسم و پیرہن کی آرائش و تزئین کی تو پوری کوشش کی جاتی ہے مگر جان اور روح سے مکمل بے پروائی برتی جاتی ہے ^۴ اور یہ بدیہی حقیقت گویا بالکل ہی فراموش کر دی گئی ہے کہ ”کتابِ الہی“ کی قراءت کا اصلی اور اولین مقصد تو تذکیر و تذکرہ ہی ہو سکتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مشہور اثر ہے:

لَا خَيْرَ فِي قِرَاءَةِ لَيْسَ فِيهَا تَذَبُّرٌ وَلَا خَيْرَ فِي عِبَادَةِ لَيْسَ فِيهَا تَفَقُّةٌ (رواہ رزین، جمع الفوائد، ج ۲، ص ۲۷۹)

”جس قراءت و تلاوت کے ساتھ تدبر و تذکرہ نہ ہو اور جس عبادت میں تفقہ نہ ہو اس میں کچھ خیر نہیں۔“

خبر بات کچھ طویل ہو گئی، ورنہ عرض تو صرف یہ کرنا تھا کہ قرآن پاک کے ساتھ اس وقت ہمارا برتاؤ کیا ہے؟ اور ہونا کیا چاہئے؟

پھر یہ سب کچھ سامنے آ جانے کے بعد اس سلسلہ کا تیسرا اور آخری سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب حالات یہ ہو چکے ہیں تو اب چارہ کار کیا ہے؟

حیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

چارہ کار

پس اگر آپ نے معاملہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے اور اس سلسلہ میں

☆ ”مکلوٰۃ شریف“ کی شرح ”التعلیق الصبیح“ میں بحوالہ شیخ ابی طالب مکی رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث بایں الفاظ نقل کی گئی ہے: (لَيْسَ لِمُعْتَبِدٍ مِنْ صَلَوَتِهِ إِلَّا مَا عَقَلَ مِنْهَا) (ج ۱ ص ۳۶۵) یعنی بندہ کو اپنی اسی نماز بلکہ اتنی ہی نماز کا اجر و ثواب ملے گا جو اُس نے سمجھ کر ادا کی ہو۔